Fikr-o-Nasar (Islamabad) 33:4 (1996)

تعارف و تبصرہ کتب

عنوان کتاب	:	تالیف
مصنف	:	ڈاکٹر خورشید رضوی
ناشر	:	شاہ تاج مطبوعات لاہور
سن اشاعت	:	۱۹۹۵ء
ضخامت	:	۲۶۴ صفحات (مجلد)
قیمت	:	۱۵۰ روپے (مناسب)
تبصرہ نگار	:	ڈاکٹر شیر محمد زمان (☆)

خورشید رضوی صاحب کے اس مجموعہ مضامین کا عنوان اپنی ندرت کے اعتبار سے چونکا دینے والا ہے۔ اسے "سادگی و پرکاری" کی ایک خوبصورت مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ مجھے اس عنوان کو دیکھتے ہوئے عربی زبان کے مشہور و معروف فارسی النسل نحوی سیبویہ (متوفی ۷۹۶ء تقریباً) کی شاہکار تصنیف الکتاب کی یاد آئی۔ ایسے عنوانات میں علمی تواضع اور شاعرانہ تغزل کا وہ امتزاج پایا جاتا ہے جو حسن کی روح ہے۔

جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ خورشید رضوی شیر خوارگی میں ہی والد کے ظل شفقت و عاطفت سے محروم ہو گئے تھے' وہی اس درد کی کسک محسوس کر سکتے ہیں جو اس شعر کے ساتھ "والد مرحوم کے نام" انتساب میں پنہاں ہے۔

ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں
ہم سا بے درد کوئی کیا ہو گا

زیر نظر مجموعے میں کل ۱۷ مضامین شامل ہیں جنہیں تین اصناف میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

(☆) سابق ڈائریکٹر جنرل ادارہ تحقیقات اسلامی' اسلام آباد

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

پہلے سات مضامین کو تاثراتی سوانحی خاکے کہا جا سکتا ہے ۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ "ہفت عجائبات" ہی تالیف کی جان ہیں تو بعید از انصاف نہیں ہوگا۔ ان ساتوں شخصیات کے ساتھ جو ان مضامین کا موضوع ہیں' رضوی صاحب کے تعلق خاطر اور دوستانہ یا نیاز مندانہ مراسم و روابط کی سطح مختلف رہی ہے۔ مگر ان کی قدر مشترک جذباتی روحانی اور ذہنی رابطوں کا وہ گہرا اور پر خلوص انسانی تجربہ ہے جو ان کی تخلیق کا باعث ہوا۔ اس میں محبت بھی ہے' عقیدت بھی' بے تکلفی بھی ہے' نیاز مندی بھی' بے ضرر تحکم بھی ہے اور گہرا احترام بھی۔ ادب و آداب اور رکھ رکھاو بھی ہے اور بے ساختہ پن بھی ۔ غرض مصنف کے دلکش اور منفرد ادبی اسلوب میں ڈھلے یہ جواہر تالیف کے خوبصورت فریم میں ایک جڑاو ھار کی طرح سجے ہیں۔ بعض جملے تو ایسے ہیں کہ نثری شاعری کے منکر بھی انھیں پڑھتے ہی اس صنف کے وجود پر ایمان لے آئیں مثلاً مجید امجد کا ذکر ہوتا ہے:

> "... تو میرے ذہن میں معاً ایک کہنہ سال عینک کے سفید شیشوں کے پس منظر میں مجید امجد کی اپنی شبیہ ابھر آتی ہے جس میں دور دیس سے آئے ہوئے ایک اجنبی ہنس کی سی خوفزدہ معصومیت کا تاثر ملتا تھا" (ص ۴۴)

یا پھر ڈاکٹر سہیل بخاری کی یاد کو کریدتے ہوئے

> "... ماضی کی گدلی جھیل کو ھلکورا دیتا ہوں تو جا بجا سنہرے بجرے جگمگ جگمگ کرنے لگتے ہیں" (ص ۷۹)

یہی ذکر ہے۔ سہیل بخاری ریٹائر ہو کر پی اے ایف کالج سرگودھا کی سرسبز اور صاف ستھری فضاوں سے اٹھ کر سیٹلائیٹ ٹاون کے ایک کرائے کے مکان میں چلے آئے تھے۔ سفید پوش طبقہ کی اس آبادی میں پانی اور کیچڑ باہم دست و گریبان رہتے تھے اس کیفیت پر تبصرہ ملاحظہ ہو:

> "بالعموم ایسے حالات میں عظمت رفتہ کا کابوس آدمی کے حواس کو دبا لیتا ہے اور گفتگو لفظ کے بجائے آہ سرد کے حوالے سے ہونے لگتی ہے' لیکن سہیل بخاری' سہیل یمانی کی طرح آب و گل کے اس کھیل سے بہت بلند اپنے افق پر جگمگاتے رہے۔ ... اور ان کی گفتگو کے شاخچوں میں لفظوں کے شگوفے اسی طرح پھوٹتے رہے" (ص ۸۰)

رضوی کا مثالی حافظہ ان تاثراتی مضامین میں بطور خاص ان کی ادبی ثروت مندی کے راز

کے طور پر جلوہ گر ہوتا ہے' میرا خیال نہیں کہ وہ باقاعدہ روزنامچہ نویسی کے اسیر رہے ہوں۔ غالباً یہ سب ان کے حافظے کا طلسم اور کرشمہ ہے جس نے اردو ادب کے ایسے لطائف کو زندہ جاوید کر دیا ہے جو بصورت دیگر محض 'گوھر نایاب" ہی رہتے۔ مولانا عبدالعزیز میمن صاحب نے جن کی اپنی قوت حافظہ اس دور میں ضرب المثل تھی' خورشید رضوی کے حافظہ کی داد دیتے ہوئے غلط نہیں کہا تھا کہ " ... آپ ایک بار سن کر یاد رکھتے ہیں جبکہ میں نے یہ سب کچھ سو سو مرتبہ نظر سے گزارا ہے" (ص ۶۴)۔ ان لطائف کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ مجید امجد اور حاجی بشیر احمد بشیر کی ادبی نوک جھونک کے ضمن میں بیان کرتے ہیں:

" ایک بار حاجی بشیر صاحب نے ایک تنقیدی نشست میں غزل پڑھی جس کی ردیف "دریا" تھی۔ ایک شعر یوں تھا:

تشنہ لب آئیں تشنہ لب جائیں
زندگی ہے فرات کا دریا

امجد صاحب کو اعتراض تھا کہ فرات کے دریا سے تشنہ لبی کی روایت دائمی ربط نہیں رکھتی بلکہ صرف ایک المناک تاریخی سانحے سے وابستہ ہے۔ چنانچہ یہاں استعارہ کامل نہیں ہو سکا۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں حاجی صاحب کی جگہ ہوتا تو یوں کہتا:

تشنہ لب آئیں تشنہ لب جائیں زندگی ہے سراب کا دریا"

ارباب ذوق کا استصواب ہو تو میدان مجید امجد کے ہاتھ ہی رہے مگر رضوی ذرا محتاط انداز میں بات کرتے ہیں۔

علمی شخصیتوں پر لکھے ہوئے مضامین علمی نوادر کا خزینہ ہیں ' مولانا عبدالعزیز میمن ' عربی زبان و ادب کے محیط کے عظیم شناور' سے عربی کا کون طالب علم ناواقف ہوگا۔ ان کے خاکہ سے ان کی جو زندہ و متحرک تصویر ابھرتی ہے اسے رضوی صاحب کے قلم کا اعجاز کہنا چاہئے۔ سیرت اور نحو جیسے متباعد موضوعات پر ایک جملے میں میمن صاحب کے محاکمہ پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ رضوی صاحب ناقل ہیں:

" الروض الانف کے بڑے مداح تھے۔ ایک روز اپنے خاص ستائشی اسلوب میں

فرمایا بھئی سیرت کے باب میں یہ آسمانی کتاب ہے' اور نحو کے باب میں سیبویہ کی کتاب آسمانی ہے" (ص ۶۲)

میمن صاحب کی علمی دھاک کی حریف کوئی اور شے ہو سکتی ہے تو ان کے بارے میں مزعومہ جز رسی کی شہرت۔ رضوی صاحب راوی ہیں:

"فرحت اللہ بیگ نے ڈپٹی صاحب کے ہاں جو جز رسی دکھائی ہے' اس کا اثر میمن صاحب کی طبیعت میں بھی تھا" [میمن صاحب ڈپٹی نذیر احمد کے شاگرد تھے] ۷۰ برس کے پیٹے میں بھی وہ گھر سے یونیورسٹی بس میں آیا جایا کرتے تھے۔ ... شام کو انڈا مکھن خریدنے بھی خود جاتے اور انڈوں کی چھوٹائی بڑائی پر بحث بھی کر سکتے تھے۔ اور بھی ایسے پہلو ان کے ہاں دیکھنے میں آئے کہ نظر بہ ظاہر انھیں بخل سے منسوب کیا جا سکتا ہے' مگر... یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اواخر عمر میں انہوں نے غالباً ایک لاکھ روپے کا عطیہ جامعہ پنجاب کو دیا" (ص ۵۷۔ ۵۶)

بلاشبہ ایسے "بخل" کے کیا کہنے جس کا نشانہ اپنی ذات ہو اور جو کارخیر کا دروازہ کشادہ کرنے کا سبب ٹھہرے۔

میمن صاحب کے مخصوص اردو لہجہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں

"میمن صاحب خود راج کوٹ کے تھے ... مگر اردو سلیقے کی بولتے تھے۔ تاہم "نوکرانی" کو وہ ہمیشہ "نوکریانی" کہا کرتے اور "پت جھڑ" کو "پت جھاڑ" ... ان دنوں ان کے ایک صاحبزادے غالباً محمد عمر میمن امریکہ گئے ہوئے تھے۔ ان کا خط آیا جس میں انہوں نے وہاں کے موسم کا نقشہ بڑے ادیبانہ انداز میں کھینچا تھا ... میمن صاحب نے یہ حصہ مجھے سنا کر تبصرہ فرمایا کہ دیکھئے یہ صاحب زادے مجھے "پت جھاڑ" کی کہانیاں سنا رہے ہیں حالانکہ میں خود "پت جھاڑ" سے بھی آگے گزر چکا ہوں" (ص ۵۶)

عمر میمن ہارورڈ کے پہلے سال (۶۵۔ ۱۹۶۴ء) میں میرے ہم سبق تھے۔ ان سے خلوص و محبت کا گہرا رشتہ اب تک ہے۔ اپنے آپ کو کوستے ہوئے اکثر کہا کرتے "بابا نے بہت جان ماری مگر ہم نے کبھی عربی پڑھ کے ہی نہ دی" یونیورسٹی آف کیلے فورنیا' لاس اینجلز کے مشہور مستشرق

آنجہانی گرو نبام Alfred Grunebaum کی زیر نگرانی ابن تیمیہ پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اردو ادب بالخصوص افسانہ نگاری سے بے حد لگاؤ تھا۔ بالاخر اسی طرف چلے گئے۔ جز رسی سے کوسوں دور تھے۔ کمال کے مہمان نواز' احباب پر جان چھڑکنے والے اور محبتوں کے پرستار' امریکہ میں اردو کے معروف اساتذہ ' محققین اور افسانہ نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بلاشبہ رضوی صاحب کے یہ خاکے جن شخصیتوں کے حوالے سے لکھے گئے اپنے ادبی محاسن کے علاوہ ان کے بارے میں تاریخی دستاویز کے طور پر یادگار رہیں گے۔

اس مجموعے کے دو مضامین عربی سے اور ایک انگریزی سے ترجمہ کیئے گئے ہیں ۔ ان میں ایک مترجم کی حیثیت سے رضوی صاحب کی ممتاز صلاحیتوں کا رنگ نکھرتا ہے۔ عربی فارسی (اردو کے دو عظیم منابع ثروت) پر ان کی غیر معمولی قدرت اور فلسفیانہ و تازہ کار ذھن میں شاعرانہ الہام پذیری کے آمیزے نے انھیں ترجمے کے نہایت مشکل مراحل کو حیرت انگیز کامیابی سے طے کرنے کی نادر صلاحیت عطا کی۔ ان مضامین سے قطع نظر فواد سیزگین کے مقالات کا اردو ترجمہ فنی مباحث کو اردو میں منتقل کرنے کی اس صلاحیت کا شاہد ہے۔ یہ ترجمہ حال ہی میں ادارہ تحقیقات اسلامی سے تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقام کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

تحقیقی مضامین پر نظر ڈالیں تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ' محتاط' ذھین وطباع محقق و مفکر ہیں' یا صاحب طرز ادیب۔ وہ یہ سبھی کچھ ہیں۔ اس مجموعے کے سات مضامین تحقیقی و تنقیدی نوعیت کے ہیں۔ اردو ادب میں ایسے نقادوں کی کمی نہیں جو عمر بھر تنقید نگاری کرتے رہتے ہیں مگر تنقید کی مخصوص زبان اور لہجے تک رسائی نہیں پا سکتے۔ رضوی صاحب کے تنقیدی مضامین میں اپنا ادبی جمال بھی ہے اور حسن انتقاد کی جچی تلی لغت کا لحاظ بھی ۔ اظہار میں ایجاز کے ساتھ ناپ تول کی نزاکت کا ایسا اہتمام کہ کوئی ایک کلمہ یا ترکیب میزان سے ادھر یا ادھر نہیں ہونے پاتا۔ کوئی لفظ ضرورت ابلاغ سے زائد نظر نہیں آتا اور ہر لفظ مفہوم و مراد پر اس طرح دلالت کرتا ہے کہ اسے اٹھا کر اس کی جگہ کوئی دوسرا نہیں رکھا جا سکتا۔ اس مجموعے کے آخری ادب پارے "تنقید اور تقلید" کے دو اقتباس ملاحظہ ہوں۔ یہ مختصر سا مضمون بذات خود اپنے موضوع پر ایک حکیمانہ محاکمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادب میں روایت کے مقام کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

اگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو بڑا تخلیق کار اس نکتے پر کھڑا ہوتا ہے جہاں ماضی حال اور مستقبل یک جان ہوتے ہیں اور زمان کی تثلیث توحید میں ڈھل جاتی ہے"

بلاشبہ یہ جملہ ادب عالیہ میں مقام اعزاز پانے کا مستحق ہے۔ اسے کسی بڑے شاعر' ادیب یا مصور کی تخلیق پر منطبق کر کے دیکھیں' اس کی صداقت ثابت اور اس کے معانی روشن ہوتے جائیں گے۔ علوم اسلامیہ کے حوالے سے اجتہاد اور تقلید اسی بحث کے شاخسانے ہیں۔ اس ضمن میں اجتہاد اور بدعت کے فرق کی فاضل گرامی مولانا صدر الدین رفاعی کے حوالے سے جو توضیح کی گئی ہے حقیقتہ اس موضوع پر ایک الہامی تمثیل کی حیثیت رکھتی ہے:

"اجتہاد اور بدعت میں وہی فرق ہے جو پیوند میں اور لباس کے اس حصے میں ہے جسے ماہر سینے والے نے جسم کے آئندہ امکانی نشیب و فراز کے پیش نظر سلائی میں دبا دیا تھا۔ اس دبے ہوئے حصے کو جب کھولا جاتا ہے تو اپنے رنگ روپ میں وہ بظاہر نیا اور باقی لباس سے الگ نظر آتا ہے۔ لیکن وہ پیوند نہیں ہے بلکہ روز اول سے اسی لباس کا ایک جزو ہے' جس کی نمود' مناسب تاخیر سے' بوقت ضرورت ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں پیوند خارج سے لگائی جانے والی ایک الگ چیز ہے۔"

تنقیدی مضامین میں سے "پنج تنتر" رضوی صاحب کی علمی فضیلت کے خاصے غیر معروف گوشے کو روشن کرتا ہے۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ اورینٹل کالج کے پنڈت یوگی شو ناتھ نے اصل سنسکرت سے کیا ہوا کلیلہ و دمنہ کا ایک پنجابی ترجمہ پنج تنتر کے عنوان سے گور مکھی رسم الخط میں شائع کیا۔ اس کے تیسرے ایڈیشن شائع شدہ ۱۹۲۵ء کے دیباچے سے رضوی صاحب نے جو پنجابی عبارت ص ۲۲۲ پر گور مکھی رسم الخط سے اردو رسم الخط میں نقل کی ہے' اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ دو دمان سادات امروہہ کا یہ فرزند گور مکھی رسم الخط پر دسترس رکھتا ہے اور ہم سے زیادہ "اصلی تے وڈا" پنجابی بھی ہے۔ یوں بھی یہ مضمون تحقیقی منہج کی ایک عمدہ مثال ہے۔

اس کتاب کی مزید تحسین کے لئے کوئی مشورہ دینا بہت مشکل ہے۔ اگر ایسا کرنا تبصرہ نگار کے لئے فرض عین ہو تو یہ کہہ کر جان چھڑائی جا سکتی ہے کہ مضامین کو ان تین اصناف میں تقسیم

کر کے اندرونی تاریخی ترتیب سے طبع کرنا شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ بلکہ "سید ضمیر جعفری کی مزاح نگاری" کو پہلے سات مضامین میں شامل کر کے اردو ادب کے خصوصی قارئین کے لئے ایک دلکش کتابچے کی شکل میں الگ شائع کرنے پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔